میرا مذہب

مفکر یگانہ جناب سلامت رضوی صاحب

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

میں بھی اسی زمرے میں شامل ہوں۔ اس زمرے کے لوگ روادار ہوتے ہیں لیکن رواداری کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا

اس دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ خدا، خدا کی مرضی، اور خدا کی ناراضگی کے بارے میں بہت اچھی طرح سے واقف ہیں جو صحیح نہیں ہے۔

یہ بات ماننا پڑے گی کہ مذہب جس صورت سے ہم تک تاریخی ارتقا کے ساتھ پہنچا ہے اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جو مذہب کی اخلاقی اور روحانی حدوں اور دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔ مثلاً زمین چپٹی ہے یا گول؟ یا زمین گائے کے سینگ پر دھری ہے۔ اور جب وہ سینگ بدلتی ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ بھلا ان مہمل اور خرافات باتوں کا تعلق اخلاقیات اور روحانیات سے کیا ہے؟ مذہب دراصل نام ہے اخلاقی سچائیوں کا جن پر مذہبی چودھریوں نے ایک ایسا پردہ ڈال دیا ہے اور ایسی اختراعات کر رکھی ہیں کہ وہ ان سے روٹی کما سکیں۔

مذہب پر جب خامہ فرسائی کی جاتی ہے اور یہ موازنہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے عقائد و مسلمات کس حد تک عقل سے قریب ہیں تو مذہب کے ٹھیکے دار زبان بند کرانے کے لئے یا استدلال کو ہوا میں اڑانے کے لئے سب سے پہلی ضرب جو مارتے ہیں وہ الحاد و دہریت کی ہوتی ہے اس لئے پہلے تصور خدا پر ذہن کو صاف کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

وجود خدا کے قائل ہونے کے ساتھ میرا تصور ذرا الگ ہے۔ یہ کہنا کہ خدا صرف میرا ہے رب العالمین کے فرمان خداوندی کے خلاف بلکہ اس کی تکذیب کے مترادف ہے۔ ہمیں خدا فہمی کے سلسلے میں روادار ہونا چاہئے۔ ہم غیروں کو اپنی اذان اسی وقت سنا سکیں گے جب ہم خود ناقوس کی آواز سن سکیں۔

بہ حیثیت انسان ہر شخص خواہ وہ ہندو ہو کہ عیسائی، سکھ ہو کہ یہودی، سنی ہو کہ شیعہ خدا کے نزدیک ایک ہے۔

منشائے خداوندی انسان کی فلاح و اصلاح ہے۔

خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ دراصل ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو اپنی برہمی سے تعبیر کیا ہے وہ ہماری مضرت سے متعلق ہے۔

تصفیہ اخلاق اور تزکیۂ نفس کے لئے یقیناً اسلام سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے۔

اسلام نام ہے سلامتی کا، اور سلامتی و رواداری ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں، لیکن دنیا طلبی و جاہ پرستی نے ہمیں ان سے دور کر دیا ہے۔ اسلامی یک جہتی کی روح

مضمحل ہوگئی ہے۔ کینہ، بغض، فساد اور نفس پرستی کی لعنت کسی نقطہ پر متحد ہونے نہیں دیتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر امبیڈکر یہ کہہ کر اسلام کے راستے پر آتے آتے نہ ہٹ جاتے کہ ''اسلام میں بہت سی جماعتیں ہیں آخر کس جماعت کا ساتھ دوں؟'' اور گاندھی جی کے بیٹے جس وقت قبول اسلام کرکے دوبارہ اپنے دیرینہ مذہب پر پلٹے تو یہ بیان نہ دیتے کہ ''میں نے مسلمانوں میں کوئی اخلاقی بلندی ایسی نہیں پائی جو دوسرے مذہب والوں میں نہ ہو۔''

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مذہب کی خانہ بندی اس طرح کی ہے:

''ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی ہے۔ سب اسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہئے۔''

''ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے اس میں مذہب اسلام درج کرادیجئے۔''

''ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے اسے نہ چھیڑیئے اور اسی میں ڈھلتے رہئے۔''

''اور ایک قسم ہے حقیقی مذہب۔۔۔۔۔۔ جو صرف علم اور تحقیق سے پیدا ہوتا ہے حقیقی مذہب اور حقیقی علم کی ایک ہی منزل ہے۔''

مولانا اس کے آگے مزید تحریر فرماتے ہیں:

''جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہیں گی ہم یہ سراغ نہیں پاسکتے۔ لیکن جوں ہی یہ پٹیاں کھلنے لگتی ہیں، صاف دکھائی دیتا ہے کہ راہ نہ دور تھی اور نہ کھوئی ہوئی اور پھر ہم تقلیدی عقیدے سے تحقیقی عقیدے پر گامزن ہوجاتے ہیں۔''

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مذہب بالکل انفرادی اور ذاتی چیز ہے۔ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ مذہب کے متعلق اپنا نقطۂ نظر خود معین کرے۔ میں مسلمان ہوں اس لئے نہیں کہ میرے باپ مسلمان تھے یا میرا خاندان مسلمان تھا۔ قرآن مجید نے ''مذہب آباء'' کو اچھا نہیں کہا ہے بلکہ خود غور و خوض کرکے ایک مذہبی شاہراہ معین کرنے کا حکم دیا ہے۔

اب رہ گیا سوال ''ترک رسوم'' کا تو میں بہت سی رسمیں ترک کرچکا ہوں۔ تحقیق پسند شیعہ ہوں اس لئے جس عالم یا دانشور کی بات پسند آتی ہے اپنا لیتا ہوں۔ نوروز کو نہیں مانتا، شب برات کی حلوہ پوری بھی نہیں کرتا۔ ۲۲/رجب کے کونڈے بھی نہیں کرتا، ان سب چیزوں کے نہ ماننے کا میرے پاس جواز ہے صرف ایک جواز سن لیجئے:

۲۲/رجب

مشہور شیعہ محقق اور مجتہد ناصرالملۃ مرحوم نے ایک استفسار کے جواب میں جو ۲۲/رجب کی نذر کے متعلق تھا وہ استفسار جواب کے ساتھ درج ذیل ہے:

''سید حسن عباس صاحب موسوی کی ادارت اور مولانا سید ناصر حسین صاحب کی سرپرستی میں شائع شدہ اخلاقی، معاشرتی، علمی ماہوار رسالہ ''الشہید'' آگرہ کی جلد(۱)

نمبر (۱۰) ۱۹۲۴ء کے رجب نمبر میں صفحہ ۲ پر باب المسائل میں پہلا سوال جو مولانا سید ناصر حسین صاحب سے کیا گیا اور جس کا جواب انھوں نے دیا وہ یہ ہے:

سوال

کیا ارشاد ہے اس مسئلہ میں کہ بائیسویں رجب حسب رواج عام خاص طور پر امام جعفر صادق -کی نذر دلوائی جاتی ہے اور ایک قصہ بطور معجزہ آنحضرت بوقت نذر پڑھا جاتا ہے۔ آیا نذر بایں صورت اور اس قصہ پر اعتقاد بہ حیثیت معجزہ رکھنا اور پڑھنا درست ہے یا نہیں۔ وہ قصہ مشہور ہے غالباً جناب بھی واقف ہوں اور آیا یہ قصہ کسی معتبر کتاب میں نظر عالی سے گزرا؟''

الجواب و باللہ التوفیق

''نذر جناب امام جعفر صادق - ہر متبرک زمانے میں مناسب ہے لیکن بالتخصیص ۲۲/رجب کی یہ عقیدہ رکھنا اور حکایت کو جو عوام میں مشہور ہے مستند قرار دیا جانا جائز نہیں ہے اور یہ حکایت کسی کتاب میں اہل تشیع کی میری نظر سے نہیں گزری اور بظاہر اصل اس کی مخالفین متصوفین سے ہے۔'' واللہ اعلم

یہ پڑھنے کے بعد میں نے کونڈے بند کر دیئے۔ ہاں کوئی بلائے تو کھانے ضرور چلا جاتا ہوں۔

ایسا ہی کچھ نوروز کے بارے میں ہے۔ یہ مجوسیوں کا تہوار ہے، اس کو ''نوروز جمشیدی'' کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ واقعہ غدیر جس دن ہوا۔۔۔۔ یعنی ۱۸/ذی الحجہ مطابق ۲۱/مارچ تھا۔ اعلان غدیر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ظہر سے کچھ قبل کیا گیا تھا اب اگر اس اعتبار سے خوشی کی نذر دلانا ہے تو وہ وقت ظہر سے کچھ قبل ہونا چاہئے۔ ہر سال سور کی سواری، ہاتھی کی سواری یا کتے کی سواری، رنگ اور بدلتے ہوئے وقت پر نذر دلانا مجوسیوں اور نجومیوں کی پیروی ہے جو از روئے فرمان علی بن ابی طالبؑ ناجائز اور حرام ہے۔
(دیکھئے خطبۂ نہج البلاغہ)

لیکن

عزاداری کرتا ہوں، مجلس کرتا ہوں، ماتم کرتا ہوں، کبھی کبھی مجلسوں میں شرکت بھی کرتا ہوں، اس کو میں رسم سمجھتا ہوں نہ رواج۔ بلکہ یہ ہماری شناخت ہے، ہماری شیعیت کی پہچان ہے، مجلسوں میں کبھی کبھی شرکت کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے ذاکروں سے (الّا ماشاء اللہ) کچھ ملتا ہی نہیں۔ پہلے کے ذاکرین سال بھر کتابیں پڑھتے تھے اور پھر ان کا نچوڑ یا یوں کہئے کہ کوزے میں دریا کو بند کر کے پیش کرتے تھے اور ہمارے علم و معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری روح کو تازگی اور بالیدگی بھی بخشتے تھے۔ آج اس کا فقدان ہے اور سچ بات یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کلب حسین صاحب مرحوم یا مولانا سید علی نقی صاحب مرحوم کو سن چکے ہیں ان کو آج کی تقریروں میں نہ مزا آتا ہے نہ لطف، بالکل اسی طرح جس طرح انیسؔ کے مرثیوں کے بعد ہر شاعر کا مرثیہ پھیکا لگتا ہے۔

تقلید

میں بہر حال اس خیال کو صحیح نہیں مانتا کہ جو کچھ زمانۂ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے اس کو قائم ہی رہنا چاہئے۔

مہر لاکھوں کا ہوتا تھا اب بھی ہو، نام ونمود کی خاطر جہیز بھی برادران وطن کی طرح ہو وغیرہ۔ اگر یہ رسوم ہماری زندگی کے لئے زہر قاتل ہیں تو فنا ہونے کے قابل ہیں۔ یہ کہنا کہ ان کو ترک کس طرح کریں یہ تو بزرگوں کے وقت سے چلی آرہی ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ مشرکین کہتے تھے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، اسی راستے پر چلتے رہیں گے۔

تقلید نہ صرف امور مذہبی میں بلکہ ہر چیز، ہر کام، ہر علم اور ہر فن میں ایسی ضروری چیز بن گئی ہے کہ اس نے ہماری عقلوں اور تحقیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔

''خبر دار! سلف کے خلاف کوئی بات زبان پر نہ لانا''

مگر حقیقت یہ ہے کہ:

درایت و اجتہاد روایت وتقلید پر مقدم ہے۔

علم کوئی جامد شے نہیں ہے۔ مہد سے لحد تک حاصل کرنے کے بعد بھی انسان پیاسا ہی جاتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے سخت سے سخت محنت، جفاکشی اور بے اندازہ ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔

مذہب وعقل کے سلسلے میں ایک جیّد عالم کی حکیمانہ بات بھی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لئے نظر اٹھائیں تو کس طرف اٹھائیں؟ ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔ بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دیوار جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل ودماغ پر چھایا رہتا تھا اب ہمارے درمیان باقی نہیں ہے۔ اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے، ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرتا ہے، تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔''

رسم ورواج اور توہمات

بقول سرسید مرحوم

''قدیم تعلیم کتاب خواں بنا رہی ہے۔ لیکن تعلیم کا اصل مقصد یہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد تو لوگوں کو قدامت پسندی اور اوہام وتاریکی کے غاروں سے نکالنا ہونا چاہئے اور ہمیں خوشی ہے کہ روایات وعقائد کا علمی نقطۂ نظر سے مطالعہ اب زیادہ زور پکڑتا جارہا ہے۔''

اور بقول نجم آفندی مرحوم

کعبے کے بت تو کچھ نہ تھے، تو نے مٹایا انھیں
سب سے بڑے بت جو تھے رسم ورواج کہن

اور یہ رسم ورواج کچھ تو جاہلانہ عقائد کی وجہ سے ہیں اور کچھ عوام کے میل جول سے۔ لیکن آج کے بدلے ہوئے حالات کے باعث بہت سے رسم ورواج اور توہمات دم توڑ چکے ہیں۔ اور ہمیں امید رکھنا چاہئے کہ علم کی فراوانی کے ساتھ باقی ماندہ بے ہودہ رسمیں اور جاہلانہ توہمات بھی دم توڑ دیں گے۔ بقول سردار جعفری:

جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے
رسم ورواج اور توہمات کو رائج ہوئے ہزاروں سال

کا زمانہ درکار ہوتا ہے۔ قدیم تہذیبوں کا مذہب اور ان کے رسم و رواج تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے اسی غرض سے پیش کئے جاتے ہیں تا کہ ہم ان کا مطالعہ کرسکیں۔ ان ہی رسموں کے رائج کرنے میں رسم و رواج نے جنم لیا اور جب کبھی ان رسم و رواج میں کوئی تبدیلی آئی تو وہ توہم بن گئے۔

ایشیا کی توہم پرستی پر جوشؔ نے تحریر کیا ہے:

''ایشیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جو روایت، اقوال اور اوہام کا پایۂ تخت ہے، یہاں ہزاروں سال سے بھوتوں، چڑیلوں، شہید مردوں، جنوں اور فرشتوں کی کہانیوں کی چھاؤں میں بچوں کو سلایا جا رہا ہے، یہاں بڑے بڑے صوفی اور شاعر حکمت پر جنون اور عقل پر عشق کو ترجیح دیتے آ رہے ہیں۔ یہاں الف لیلہ، اندر سبھا، چہار درویش اور طلسم ہوش ربا کے مزخرافات کو ذہنوں میں پالا پوسا جا رہا ہے، یہاں براہین قاطعہ کی گردنوں پر کشف و کرامات کی چھریاں چلائی جاتی ہیں۔''

قدیم تہذیب کے مذاہب کا مطالعہ کرنے پر ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ یہ سارے مذاہب ڈر، خوف، لالچ، نفع اور نقصان کی بنیادوں پر ظہور میں آئے۔ اور یہ کہ ہر مذہب میں مذہب کی لگام ایک مخصوص طبقے کے ہاتھوں میں رہی۔ اور یہ طبقہ جلبِ منفعت کے لئے عوام کالانعام کو ہر طرح سے شیشے میں اتارتا تھا۔ سبز باغ دکھاتا تھا اور خداؤں کو خوش کرنے کے لئے ان سے طرح طرح کی رسمیں کراتا تھا۔ بھولے بھالے عوام کو بھوت، پریت، چڑیل اور بدروحوں سے ڈراتا تھا اور پھر ان کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے طرح طرح کے عمل، نقش، ٹونے، ٹوٹکے انجام دیتا تھا اور ان تمام باتوں میں خاص بات یہ تھی کہ عوام کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ از خود خداؤں کو خوش کرنے کے لئے یہ رسمیں انجام دیں۔ یہ سارے کام صرف اسی مخصوص طبقے ہی کے ذریعے ممکن تھے۔

ستاروں کی گردش پر چونکہ یقین تھا اس لئے ہر کام کے لئے ایک شبھ گھڑی مقرر تھی۔ یہ شبھ گھڑی بھی اسی طبقے کے قبضہ میں تھی۔ کام کو مخصوص تاریخ اور وقت پر شروع کرنا اور پھر ہر سال اس کا اعادہ تہوار کہلاتے اور ان تہواروں کی مناسبت سے غذا، لباس اور دوسری چیزوں کا استعمال رسم و رواج کہلاتا تھا۔

ستارہ پرستی اسلام نے حرام قرار دی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت علی کا ایک خطبہ قابل ملاحظہ ہے۔

جب آپ نے خوارج سے جنگ کرنے کی خاطر نکلنے کا ارادہ کیا تو ایک شخص نے کہا ''یا امیر المومنین اگر آپ اس وقت نکلے تو علم نجوم کی رو سے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب و کامران نہیں ہوسکیں گے۔'' جس پر آپ نے فرمایا:

''کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم اس گھڑی کا پتہ دیتے ہو کہ اگر کوئی اس میں نکلے تو اس کے لئے کوئی برائی نہ ہوگی اور اس لمحے سے خبردار کرتے ہو کہ اگر کوئی اس میں نکلے تو اسے نقصان درپیش ہوگا۔ تو جس نے اسے صحیح سمجھا اس نے قرآن کو جھٹلایا اور مقصد کے پانے اور مصیبت کے دور کرنے میں اللہ کی مدد سے بے نیاز ہوگیا۔ تم اپنی ان باتوں سے یہ چاہتے

ہو کہ جو تمہارے کہے پر عمل کرے وہ اللہ کو چھوڑ کر تمہارے گن گائے، اس لئے کہ تم نے اپنے خیال میں اس ساعت کا پتہ دیا کہ جو اس کے لئے فائدے اور نقصان کا ذریعہ بنا۔''

(پھر آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا)

''اے لوگو! نجوم کے سیکھنے سے پرہیز کرو مگر اتنا کہ جس سے خشکی وتری میں راستے معلوم کر سکو اس لئے کہ نجوم کا سیکھنا کہانت اور غیب گوئی کی طرف لے جاتا ہے اور حکم میں مثل کاہن کے ہے اور کاہن مثل ساحر کے اور ساحر مثل کافر کے اور کافر کا ٹھکانہ جہنم ہے، بس اللہ کا نام لے کر چل کھڑے ہو۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر: ۷۷)

مذکورۂ بالا خطبہ کی روشنی میں غور کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ پیش گوئی کرنے والے تمام ''علم'' چاہے نجوم ہو یا جفر، رمل ہو یا فراست الید سب حرام ہیں اور ان کے عامل کافر اور جہنمی۔

اب ساعت، دقیقہ، رنگ اور سواری دیکھ کر نوروز میں خود اسی کی نذر دینا جو اس کے خلاف تھا کس حد تک درست ہے؟

علم نجوم کی دو قسمیں ہیں:

مشہور عالم، میرے محترم، دوست اور ہم پیشہ عالی جناب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری رقم طراز ہیں:

''علم نجوم کی دو قسمیں ہیں، ایک سے ستاروں کے خواص واثرات معلوم کرتے ہیں اور لوگوں کے طوالع وبروج بتا کر سعد ونحس اور ان کی اچھائی اور برائی کی خبر دیتے ہیں یہ قسم اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر حرام ہے۔

علم نجوم کی دوسری قسم میں ستاروں کی رفتار سے بحث ہوتی ہے۔ یہ حساب اور تجربے کے بنا پر ہے۔ اس میں غیب دانی کا دعویٰ نہیں ہوتا۔ چاند کب نکلے گا؟ سورج اور چاند کو گہن کب ہوگا یہ سب ستاروں کی چال کے حساب پر موقوف ہے۔ اس علم نجوم کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدرسوں میں اب سے کچھ دن پہلے اس کی با قاعدہ تعلیم دی جاتی تھی۔

آج کوئی ایسی بات جس پر سچ ہونے کا یقین نہ ہو جائے سچ نہیں مانی جا سکتی اس لئے ہمیں اپنے اعتقادات کا جائزہ لینا ضروری ہے، تاریخہائے سعد ونحس، قمر در عقرب، تحت الشعاع اور اسی قسم کے دوسرے مہملات پر عمل کرنا ایک غیر منطقی بات ہے۔

با ایں همه

مذہب انسان کو اخلاق سکھاتا ہے۔ ان اعلیٰ اقدار سے روشناس کراتا ہے جو انسان کی دینی اور دنیاوی زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنا سکیں۔

مذہب سے انسان میں رواداری، مساوات، اخوت، مروت اور حب الوطنی کے پاکیزہ جذبات پیدا ہوتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ مذہب ہی کی بدولت یہ حیوان ناطق انسان کہلانے کا مستحق ہے کیونکہ مذہب انسان میں انسانیت کے خصوصیات پیدا کرتا ہے۔

اس کے برعکس

مذہب سے بیگانہ رہ کر انسان اوباش، بدقماش، بداخلاق، بے مروت، بے غیرت، ظالم اور جرائم پیشہ بن جاتا ہے اور ایسے افراد معاشرے میں ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

❁❁❁